اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا (فاطر:32)

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ مَقَامٍ اٰخَر

وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰہِ وَکَانُوْا عَلَیْہِ شُھَدَآءَ

(المآئدہ:44)

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ مَقَامٍ اٰخَر

کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (ال عمرٰن:79)

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ ۔وَالْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ

کتاب الٰہی کے محافظ:۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰہِ (المآئدہ:44) رَبَّانِیُّوْنَ سے مراد ''رب والے'' ''اللہ والے'' اَحْبَار حِبر کی جمع ہے، یعنی ''علم والے''۔ یعنی ''علمائے کرام اور مشائخ عظام'' ان کا فرضِ منصبی کیا ہے؟ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰہ (المآئدہ:44) انہوں نے اللہ رب العزت کی کتاب کی حفاظت کرنی ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی ہر ہر آیت پر ڈیرے ڈالنے ہیں۔ الفاظ کی بھی حفاظت کرنی ہے اور معانی کی بھی حفاظت کرنی ہے۔

جس طرح حفاظِ کرام الفاظِ قرآن کے محافظ ہیں اور علمائے کرام معانیٔ قرآن کے محافظ ہیں، اسی طرح محدثین کرام الفاظِ حدیث کے محافظ ہیں اور فقہائے کرام معانیٔ حدیث کے محافظ ہیں۔

حدیث کہتے ہیں بات کو اور فقہ کہتے ہیں بات کی سمجھ کو۔

فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيثًا (النسآء:78)

''اس قوم کو کیا ہوا کہ بات ہی نہیں سمجھتے؟''

بات کی سمجھ انسان کو تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ بچے جو آج شاگرد بن کر استاد کے سامنے پڑھ رہے ہیں یہ کل مسندِ ارشاد پر بیٹھ کر دوسروں کو پڑھا رہے ہوں گے۔

نیت کی اہمیت:

ہر عمل کی ابتدا نیت سے ہوتی ہے۔ اس لیے آج کی اس محفل میں طلبا اپنے کام کی ابتدا تصحیحِ نیت کے ساتھ کریں۔ انسان جس راستے پر چلتا ہے اسکے ذرات بھی نظر آتے ہیں اور جس راستے پر نہیں چلتا اس کے پہاڑ بھی نظر نہیں آتے۔ نیت کو صحیح کرنا یہ عمل کی بنیاد ہے۔ نبی علیہ السّلام نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

اکابرینِ امت نے نیت کی اہمت کے بارے میں گراں قدر اقوال ارشاد فرمائے ہیں، مثال کے طور پر:

☆ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

لَا عَمَلَ لِمَنْ لَّا نِيَّةَ لَهٗ

''جس بندے کی کوئی نیت نہیں اس کا عمل نہیں''

☆ یحییٰ بن کثیر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''نیت کرنا سیکھو! اس لیے کہ نیت کرنا عمل سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔''

داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کبار اولیا میں سے گزرے ہیں۔ وہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں

میں سے تھے۔انہوں نے جو مجلس تدوینِ فقہ بنائی تھی اس کے چالیس نمایاں حضرات میں سے تھے۔ اس مجلس میں،

☆امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جیسے کثیر الحدیث عالم تھے،

☆ قاسم بن معین اور محمد بن حسن جیسے ادب اور عربیت کے ماہر تھے،

☆امام زفر رحمۃ اللہ علیہ جیسے قیاس اور استحسان کے بادشاہ تھے،

اس مجلس میں داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ جیسے تقویٰ کے پہاڑ بھی تھے۔ یہ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''حسن نیت ہر خیر کا مجموعہ ہے۔''

☆ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ خود صاحبِ مذہب فقیہ گزرے ہیں۔ یہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے عمر میں کچھ بڑے تھے مگر علم میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کرتے تھے۔ان کی کتب منگوا کر اپنے پاس رکھا کرتے تھے اور پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک عالم ان سے ملنے آئے تو انہوں نے ان کے سرہانے کے نیچے پڑی ایک کتاب دیکھی۔ وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی لکھی ہوئی کتاب ''کتاب الرھن'' تھی۔انہوں نے پوچھا: حضرت! آپ بھی یہ کتابیں پڑھتے ہیں؟ فرمانے لگے:

''میرا جی چاہتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کی سب کتابیں میرے پاس ہوں اور میں ان سے فائدہ اٹھاؤں۔''

یہ سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے:

''میں اپنی نیت کی نگرانی سب سے زیادہ کرتا ہوں اس لیے کہ یہ ہر وقت ادلتی بدلتی رہتی ہے۔''

یعنی نیت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ نیت کی نگرانی بھی کرتے تھے۔

☆امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک بزرگ آتے تھے۔ان کو ابو ہاشم صوفی کہا جاتا تھا۔آپ

فرمایا کرتے تھے:

''اگر ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو میں ریا کی دقیق باتوں سے کبھی واقف نہ ہوسکتا۔''

اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھ کر پتہ چلتا ہے کہ ریا کیا ہوتی ہے اور تصحیح نیت کیا ہوتی ہے؟

☆ یوسف بن اسباط رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''نیت کو ٹھیک رکھنا بڑے بڑے عمل کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔''

☆ عبد اللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ان کے بارے میں سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اس بات کی آرزو ہی کرتا رہا کہ میری زندگی کا کوئی ایک سال عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی مانند گزر جائے مگر میں تین دن سے زیادہ اس ترتیب پر نہ گزار سکا۔ وہ عبد اللہ بن مبارک فرمایا کرتے تھے۔

''نیت کے صحیح ہونے سے چھوٹے عمل بھی اللہ کے ہاں بہت بڑے بن جایا کرتے ہیں اور نیت کے صحیح نہ ہونے سے بڑے عمل بھی اللہ کے ہاں بے قیمت بن جایا کرتے ہیں۔''

حصولِ علم میں نیت کا پہلو:

طلبا کی نیت کیا ہو؟ کیا یہی نیت ہو کہ

☆ ہم عالم بن کر خطیب بنیں گے،

☆ فقیہ بنیں گے،

☆ واعظ بنیں گے،

☆ امام بنیں گے،

نہیں، نیت یہ ہونی چاہیے کہ میں اپنے اللہ کو راضی کرنا چاہتا ہوں، میں یہ کام کیسے کروں، یہ علم مجھے

کتابوں سے ملے گا، لہٰذا میں وہ علم پڑھنے کے لیے اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ جب آپ اس نیت کے ساتھ پڑھیں گے تو پھر اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق بھی عطا فرما دیں گے۔

نیت کی فوقیت عمل پر:

نبی علیہ السّلام نے دوسری جگہ پر فرمایا:

نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ

''مومن کی نیت اس کے عمل سے بھی زیادہ بہتر ہوتی ہے''

اس کی تین وجوہات ہیں:

سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ مومن جب بھی کسی نیک عمل کی نیت کرتا ہے تو اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی فوراً لکھ دی جاتی ہے۔ اگرچہ بعد میں وہ عمل کرے اور ریاکاری کی وجہ سے اس عمل پر کوئی اجر نہ ملے۔ یعنی عمل پر اجر ملے نہ ملے، نیت پر اجر فوراً مل جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نیت کے اندر دوام ہے، نیت کے اندر طول ہے، عمل کے اندر نہیں.....وہ کیسے؟.....کہ ایک آدمی زندگی میں نیکی تو سو سال کرتا ہے، اس سے زیادہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی عمر ہی اتنی ہوتی ہے۔ گویا کہ عمل کی ایک حد ہے۔ لیکن اس پر اس کو اجر کیا ملے گا؟ کہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا۔ اسی طرح ایک آدمی نے گناہ تو کیے سو سال، لیکن ہمیشہ ہمیشہ جہنّم میں رہے گا۔ اب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ محدود عمل پر ہمیشہ سزا، یا محدود عمل پر ہمیشہ جزا!.....اس کا کیا مطلب ہوا؟.....علما نے اس کا جواب لکھا ہے کہ جس نے سو سال نیکی پر گزارے اس بندے کے دل میں نیت یہ تھی کہ جب تک وہ زندہ رہے گا، اس وقت تک اللہ رب العزت کی فرمانبرداری کرتا رہے گا۔ چنانچہ اسی نیت کی وجہ سے

اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت کی نعمتیں دے دی گئیں۔ اور دوسری طرف جو کافر تھا، اس کی نیت یہ تھی کہ میں اللہ کو نہیں مانوں گا۔ چونکہ اس کی نیت ایسی تھی اس لیے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنّم کی سزا دی جائے گی۔ تو عمل محدود ہوتا ہے مگر نیت کے اندر طول ہوتا ہے، اس لیے نیت عمل سے زیادہ افضل ہوتی ہے۔

علما نے اس کی ایک تیسری وجہ بھی لکھی ہے۔ وہ یہ کہ عمل تو انسان جسم کے کسی بھی عضو سے کر سکتا ہے مگر نیت ہمیشہ دل سے ہوتی ہے۔ اور دل چونکہ باقی اعضا سے افضل ہے اس لیے مومن کی نیت بھی باقی اعمال سے افضل ہوتی ہے۔

نیت کی خرابی، اعمال کی بربادی:

یاد رکھیں! جس طرح سرکہ شہد کو فاسد کر دیتا ہے اسی طرح نیت کی خرابی بھی انسان کے عمل کو فاسد کر دیتی ہے۔ ہمارے مشائخ نے کہا کہ اگر انسان چھٹانکوں کے حساب سے اپنے عمل پر محنت کرتا ہے تو منوں کے حساب سے اسے اپنی نیت پر محنت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیت یہ ہونی چاہیے کہ ہم جو کچھ بھی کریں اللہ رب العزت کی رضا کے لیے کریں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ فقط نیت سے ہی کام بن جائے گا۔ ایک آدمی سفر کی نیت تو کر لے کہ منزل پر جانا ہے مگر قدم ہی نہ اٹھائے تو وہ منزل پر ہرگز نہیں پہنچ سکے گا۔ چنانچہ اگر انسان محض تمناؤں سے سوچے کہ مجھے جنت ملے گی تو یہ احمقوں کی بات ہو گی۔ اس لیے کہ عمل ضروری ہے۔

عملِ صالح کی ضرورت واہمیت:

یہی وجہ ہے کہ ایمان لانے کے ساتھ ساتھ عمل صالح کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَانَتۡ لَہُمۡ جَنّٰتُ الۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا (الکھف:107)

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا،

فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا (الکھف:110)

نیک اعمال ہی کی وجہ سے بندے کو اللہ رب العزت کے ہاں عزت نصیب ہوگی۔اسی لیے کافر لوگ قیامت کے دن اعمال نہ ہونے کی وجہ سے پریشان پھریں گے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَوۡ تَرٰۤی اِذِالۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاکِسُوۡا رُءُوۡسِہِمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ (السجدہ:12)

اگر آپ دیکھیں ان مجرموں کو جو اپنے رب کے سامنے شرمساری کی وجہ سے سر جھکا کے کھڑے ہوں گے۔

اور کیا کہیں گے؟

رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا(السجدہ:12)اے ہمارے پروردگار!اب ہم نے دیکھ لیا۔

وَسَمِعۡنَا (السجدہ:12)اور ہم نے سن لیا۔

فَارۡجِعۡنَا (السجدہ:12) ''پس ہمیں واپس دنیا میں لوٹا دیجئے''

نَعۡمَلۡ صَالِحاً اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ (السجدہ:12)

''اب ہم نیک عمل کریں گے،ہمیں پکا یقین آ گیا ہے''

تو معلوم ہوا کہ قیامت کے دن مجرم لوگ بھی تمنا کریں گے کہ اے کاش! ہم نے بھی نیک عمل کیے ہوتے۔

قیامت کے دن انسانوں کو بہت حسرت ہوگی۔اس لیے قیامت کے دن کا ایک نام ''یَوۡمُ الۡحَسۡرَۃِ''

(حسرت کا دن) بھی ہے۔ بہت حسرتیں ہونگی کہ کاش! ہم نے یہ نہ کیا ہوتا۔

☆ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا (الفرقان:27)

☆ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا (الفرقان:28)

کاش میں نے فلاں سے دوستی نہ لگائی ہوتی۔

لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ط وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا

(الفرقان:29)

تو فرمایا: اس دن تمام انسانوں میں سب سے زیادہ حسرت اس عالم کو ہوگی جس کی باتوں کو سن کر لوگ عمل کریں گے اور جنت میں جا رہے ہوں گے اور وہ خود اپنے عمل کی کمزوری کی وجہ سے جہنّم میں ڈالا جا رہا ہوگا۔ اس لیے ایک صحابیؓ فرمایا کرتے تھے کہ عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تم دیکھو گے کہ جاہل عبادت گزار ہوں گے اور وقت کے علما بدکار ہوں گے۔ اس لیے علم پر عمل کرنا انتہائی ضروری ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنّم بھی

جو اعمال ہم کر رہے ہیں وہ ہمارے لیے جنت اور جہنّم کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ ہمارا اٹھنے والا ہر قدم یا تو ہمیں جنت کے قریب کر رہا ہے یا جہنّم کے قریب کر رہا ہے۔ اگر شریعت کے مطابق ہے تو جنت کے قریب اور اگر نفسانیت اور شیطانیت کی وجہ سے ہے تو جہنّم کے قریب۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ علم پر عمل کرنے والا انسان اللہ کا دوست ہوتا ہے، لہٰذا انسان اس بات سے اللہ رب العزت کی پناہ مانگے کہ زبان عالم ہو اور دل جاہل ہو۔ اس لیے ہمارے اکابر فرماتے تھے کہ دنیا میں ہر کسی کا محبوب ہوتا ہے اور ہمارا محبوب نیک عمل ہے، وہ جہاں ملے گا ہم اسے پائیں گے، یعنی کرنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ نیک اعمال کی تلاش میں رہیں، جتنا کر سکتے ہیں کر لیجیے۔ جیسے تاجر کو جہاں بھی کچھ نفع ہو وہ اسے چھوڑتا

نہیں۔اسی طرح یہ نیک اعمال ہمارے لیے نفع ہیں، اس لیے ہر دن میں انہیں اکٹھا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ نیک عمل کر کر کے تھکیں اور تھک تھک کر پھر نیک عمل کریں۔ایک شوق اور لگن ہو،اس لگن کے ساتھ انسان نیک اعمال کرنے میں مگن ہو۔ جب کسی کے پاس وقت کم ہوتو وہ تیزی سے کام کرتا ہے۔مثال کے طور پر: ایک طالب علم امتحان دے رہا ہے اور وقت بہت کم ہے تو وہ تیز تیز لکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کھلاڑی کے پاس وقت کم ہوتو وہ زیادہ سے زیادہ رنز بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری زندگی کا وقت کم ہے۔اس لیے ہم بھی زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرنے کی کوشش کریں۔اور یہ بھی کوشش کریں کہ ہم ایسے اعمال کریں جن پر ہمیں بہترین اجر مل سکے۔

رسوخ فی العلم کی معاون تین چیزیں:

جلالین شریف کے حاشیے میں لکھا ہوا ہے کہ راسخین فی العلم میں شامل ہونے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔

(۱) تقویٰ:

سب سے پہلی چیز ہے کہ بندے کے اندر تقویٰ ہو۔

اَلتَّقْوٰی فِیْمَا بَیْنَہٗ وَ بَیْنَ اللّٰہِ

''تقویٰ وہ ہے جس کا تعلّق بندے اور اللہ کے درمیان ہے۔''

تقویٰ کچھ کرنے کا نام نہیں، بلکہ کچھ کام نہ کرنے کا نام تقویٰ ہے۔تقویٰ کی آسان تعریف یہ ہے کہ ''ہر اس عمل کو ترک کر دینا جس کے کرنے سے تعلّق باللہ میں فرق آجائے، تقویٰ کہلاتا ہے۔''

دل کی گواہی:

تعلّق باللہ میں فرق آرہا ہوتا ہے یا نہیں، یہ دل بتاتا ہے۔ اللہ رب العزت نے سینے میں جو یہ دل بنایا ہے، یہ انسان کو صحیح صورت حال بتاتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ اگر تم اپنی حقیت معلوم کرنا چاہو تو اپنے دل سے گواہی لو، دل وہ گواہ ہے جو کبھی رشوت قبول نہیں کرتا، ہمیشہ سچی گواہی دیتا ہے۔ چنانچہ ہم جب بھی اپنی اوقات معلوم کرنا چاہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے دل کے اندر جھانک کر دیکھیں، ہمیشہ سچی گواہی ہی آئے گی۔ دنیا میں دل کی عدالت سے بڑی عدالت کوئی نہیں۔ اس لیے ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو ضمیر کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر کے پوچھا کریں کہ کتنے پانی میں ہو؟ اندر سے صحیح گواہی ملے گی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ اَفْتَاكَ الْمُفْتِيُوْنَ

تقوی کی اہمیت:

قرآن مجید میں جتنی تقوی کی اہمیت بتائی گئی ہے، شاید کسی دوسرے عمل کی اتنی اہمیت نہیں بتائی گئی۔ ایک ایک آیت میں دو دو اور تین تین مرتبہ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے! اگر پورے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ صرف ایک مرتبہ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم فرما دیتے تو اس کا اختیار کرنا فرض ہو جاتا۔ مگر ہر چند آیتوں کے بعد اِتَّقُوْا اللّٰہ، اِتَّقُوْا اللّٰہ، اِتَّقُوْا اللّٰہ فرمایا۔ پھر ایک ایک آیت کے اندر دو دو مرتبہ بھی فرمایا۔ کوئی آدمی ایک ہی بات کو ایک سانس میں دو مرتبہ دہرائے تو اس سے اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (الحشر:18)

دیکھیں! آیت کے شروع میں بھی اِتَّقُوْا اللّٰہَ اور آخر میں بھی اِتَّقُوْا اللّٰہَ فرمایا۔ یہاں تو ایمان والوں سے خطاب کیا اور دوسری جگہ سب انسانوں سے خطاب فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ (النسآء:1)

آیت ایک ہی ہے اور اس میں دو مرتبہ تقویٰ کا حکم دیا۔

حصولِ برکت اور تقویٰ:

تقویٰ اختیار کرنے سے انسان کی زندگی میں برکتیں آتی ہیں۔ آج زندگیوں میں جتنی پریشانیاں ہیں، یہ برکت کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔

نہ مال میں برکت

نہ قوّتِ حافظہ میں برکت

نہ عزت میں برکت

نہ صحت میں برکت

برکت ختم ہوتی جارہی ہے۔ تقویٰ کے سبب برکت نازل ہوتی ہے اور معصیت کے سبب برکت زائل ہو جاتی ہے۔ قرآن عظیم الشان میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (الاعراف:96)

”اگر ان بستی دیسوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان سے اور زمین سے برکتوں

کے دروازے کھول دیتے‘‘

اللہ والوں کی ہر چیز میں برکت ہوتی ہے۔کیونکہ وہ راسخین فی العلم ہوتے ہیں۔ان کے وقت میں برکت آجاتی ہے۔وہ تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرجاتے ہیں۔چند مثالیں سن لیجیے:

☆حضرت اقدس تھانویؒ کی 925 کتابیں دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ کتابیں انہوں نے بلا واسطہ لکھیں اور جو کتابیں انہوں نے اپنے شاگردوں اور خلفا کو ہدایات دے کر لکھوائیں، ان کو بھی ملا کر سب کتابوں کی تعداد 2700 بنتی ہے۔ہم ابھی تک ان کتابوں کو پڑھ بھی نہیں سکے۔

☆ایک بزرگ ایسے بھی گزرے ہیں کہ انہوں نے اتنی کتابیں لکھیں کہ جب وہ فوت ہوئے تو ان کی زندگی کے ایام کو ان کی کتابوں کے صفحات پر تقسیم کیا گیا تو بیس صفحے روزانہ کے بنے۔اب بیس صفحے نئی کتاب کے روزانہ لکھ دینا کوئی آسان کام نہیں۔یہ کیا چیز تھی؟ یہ برکت تھی۔

☆قوت حافظہ میں بھی برکت تھی۔ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شاگرد ایک مرتبہ رات کو دیر سے گھر آیا۔بیوی الجھ پڑی کہ دیر سے کیوں گھر آیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ درس میں تاخیر ہوگئی۔اس نے کہہ دیا کہ تیرے استاد کو ہی نہیں کچھ آتا، تجھے کیا آئے گا۔اس نے غصے میں آکر کہا: اچھا! اگر میرے استاد کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں تو تجھے تین طلاق۔

جب رات گزر گئی تو ان کے دماغ ذرا ٹھنڈے ہوئے۔بیوی نے پوچھا: جی! طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ کیونکہ مشروط طلاق تھی۔وہ اپنے استاد کے پاس پہنچے۔ابو ذرعہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: حضرت! یہ واقعہ پیش آیا ہے، کیا ہمارا نکاح باقی ہے یا نہیں؟ حضرت مسکرائے اور فرمایا: جاؤ! میاں بیوی کی زندگی گزارو، ایک لاکھ حدیثیں مجھے اس طرح یاد ہیں جس طرح لوگوں کو سورت فاتحہ یاد ہوتی ہے۔

زمین کی زینت اور تقویٰ:

یاد رکھیے! آسمان کی زینت ستاروں سے ہے، زمین کے زینت پرہیزگاروں سے ہے۔ جیسے ہمیں آسمان پر ستارے جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں اسی طرح آسمان والوں کو زمین پر متقی لوگ یوں جھل مل کرتے نظر آتے ہیں۔

معاملات اور تقویٰ:

یہ تقویٰ فقط کھانے پینے کی حد تک محدود نہیں۔ یہ پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔ معاملات میں بھی تقویٰ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ امام اعظمؒ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا مطالعہ کر کے دیکھیے۔ تقویٰ کو سمجھنا ہو تو ان کی زندگی بہترین مثال ہے۔

ابتدا میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ایک دن ظہر کے وقت دکان بند کر کے آرہے ہیں۔ کسی نے پوچھا: نعمان! آپ کہاں جا رہے ہیں؟ جواب دیا: دکان بند کر کے جا رہا ہوں۔ پوچھا: حضرت! اتنی جلدی؟ فرمایا: ہاں! آج موسم ابر آلود ہے اور جب آسمان پر بادل ہوں اس وقت روشنی ٹھیک نہیں ہوتی اور یوں گاہک کو کپڑے کی صحیح کوالٹی کا پتہ نہیں چلتا، میں نے دکان اس لیے بند کر دی کہ کوئی کم قیمت کپڑے کو بیش قیمت کپڑا سمجھ کر دھوکہ نہ کھا جائے۔ اس امت کو تجارت یا تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سکھائی یا پھر امام اعظم ابوحنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ نے سکھائی۔

احتیاط ہی تقویٰ ہے:

آدمی کو ہر کام میں احتیاط کرنی چاہیے۔ مثلاً غیر محرم کے چہرے کی طرف دیکھنا حرام ہے اور اگر برقع میں ہو اور اس پر نظر پڑ جائے تو فتویٰ ہے کہ اس کی اجازت ہے۔ لیکن اس کے کپڑوں کو بھی نہ دیکھنا، اس کا نام تقویٰ ہے۔ یعنی غیر عورت کا چہرہ تو کیا دیکھنا اس کے کپڑوں کو بھی نہ دیکھے۔ یہ سوچے کہ یہ نیلی ہے،

پیلی ہے، جو ہے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔

چنانچہ متقی لوگ ہی اللہ کے ولی بنتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنۡ اَوۡلِیَآؤُہٗۤ اِلَّا الۡمُتَّقُوۡنَ(الانفال:34)

''اس کے ولی وہی ہوتے ہیں جو متقی ہوتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ (المآئدہ:27)

''بے شک اللہ تعالیٰ متّقیوں ہی کے عملوں کو قبول فرماتے ہیں۔''

(۲) تواضع:

طالب علم میں دوسری چیز ایسی ہونی چاہیے جو اس کے اور دوسرے بندوں کے درمیان تعلّق رکھتی ہے۔اس کو ''تواضع'' کہتے ہیں۔

فِیۡمَا بَیۡنَہٗ وَبَیۡنَ النَّاسِ

یعنی جو معاملات اللہ کے بندوں کے ساتھ ہوں اس میں طبیعت کے اندر تواضح ہو۔تواضع کسے کہتے ہیں؟ دوسروں کے سامنے چھوٹا بن کر رہنا، تواضع کہلاتا ہے۔

بڑا بننے کا طریقہ:

نفس چاہتا ہے کہ بڑا بن کر رہے۔یاد رکھنا! جو بڑا بننا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ چھوٹا بن کر رہے۔اللہ تعالیٰ اسے بڑا بنادیں گے۔چھوٹا بن کے رہنے میں بڑائی ہے۔ ؎

زمین کی طرح جس نے عاجزی و انکساری کی

خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانپا آسماں ہو کر

ہمیں تواضع کا یہ سبق اوپر سے ملا ہے۔حدیث پاک میں آیا ہے کہ

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ

''جس نے اللہ کے لیے تواضع اختیار کی، اللہ رب العزت اس کو بلندی عطا فرما دیتے ہیں۔''

نبی علیہ السّلام جب کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے تھے تو آپ ﷺ ٹیک نہیں لگاتے تھے۔آپ ﷺ فرماتے تھے کہ میں اس طرح بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں جس طرح غلام اپنے آقا کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا مانگتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیرًا وَ فِیْ اَعیُنِ النَّاسِ کَبِیرًا

''اے اللہ! مجھے لوگوں کی نگاہوں میں بڑا کر دے اور مجھے میری اپنی نگاہوں میں چھوٹا بنا دے۔''

لوگوں کی نگاہوں میں بڑا کر دے کا کیا مطلب؟ اس لیے کہ بندہ دعوت الی اللہ کا کام اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک لوگوں کی نظر میں اس کا مقام نہیں ہوگا.....آج حالت یہ ہے کہ ہم لوگوں کی نظر میں چھوٹے ہوتے ہیں اور اپنے آپ میں ہم بہت بڑے ہوتے ہیں ہر وقت یہی بات ذہن میں ہوتی ہے کہ اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (الاعراف:12) میں اس سے اچھا ہوں۔

دس پندرہ بندے پڑھانے والے ہوں تو ہر ایک کہتا ہے کہ میں اس سے اچھا ہوں۔مل کر رہنے والے ہوں تو الجھ پڑتے ہیں، ہر ایک کہتا ہے کہ میں اس سے اچھا ہوں۔ آج لڑائی اس بات کی ہی ہے۔ہمارے مشائخ ایک عجیب بات فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طلبا کو اس طرح رہنا چاہیے کہ ہر

طالب علم دوسرے دوستوں کو سمجھے کہ اصحابِ کہف کی مانند ہیں اور میں اصحاب کہف کے کتے کی مانند ہوں، جس طرح اصحابِ کہف کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے کتے کے ساتھ مغفرت کا وعدہ فرمالیا، میرے دوستوں کے صدقے مولا میری بھی مغفرت فرما دیں گے۔ ہم اس طرح دوسروں کو عزت دے کر دیکھیں، پھر دیکھنا کہ اللہ تعالیٰ کیسے بلندیاں عطا فرماتے ہیں؟

ہمارے حضران نے تو ہمیں چھُپنا سکھایا ہے، مگر آج لوگ چھَپنا پسند کرتے ہیں۔ اخبار والوں سے جا کر الجھتے ہیں کہ ایک کالم کی خبر کیوں لگائی؟ تین کالم کی ہونی چاہیے تھی۔ کیا اس طرح عزتیں ملیں گی؟ نہیں، بلکہ جھکنے سے عزتیں ملتی ہیں۔

فقیرانہ شان میں اسلام کی وکالت:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ دعوت دی گئی کہ آپ شاہجہان پور میں آئیے اور دینِ اسلام کی دعوت دیجیے۔ عیسائیوں نے بھی آنا تھا، ہندوؤں نے بھی آنا تھا، اس کے علاوہ اور ادیان کے لوگوں نے بھی آنا تھا اور وہاں پر ہر ایک نے اپنے دین کی بات کرنی تھی۔ اس پر ''مباحثہ شاہجہان پور'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی موجود ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ چل پڑے۔ حضرتؒ نے ان کو بتا دیا تھا کہ میں ایک دن پہلے ریل گاڑی کے ذریعے پہنچ جاؤں گا۔ حضرت اکیلے ہی چلے تھے۔ ابھی حضرت دو اسٹیشن پیچھے تھے تو دل میں خیال آیا کہ میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ ریل گاڑی کے ذریعے آؤں گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرے استقبال کو آجائیں، اور میں تو استقبال کے قابل ہی نہیں ہوں۔ چنانچہ خیال آیا کہ ایک اسٹیشن پہلے اتر جاتا ہوں، آگے پانچ میل کا فاصلہ ہے، وہ میں پیدل ہی طے کرلوں گا۔

چنانچہ حضرت ایک اسٹیشن پہلے اتر گئے اور پیدل چل پڑے۔ راستے میں ایک بڑی نہر عبور کرنی پڑ گئی۔

اس کا پل نہیں تھا۔ جب نہر عبور کی تو حضرت کا پاجامہ اس میں بھیگ گیا۔ حضرت نے تہبند باندھ لیا اور پاجامہ کو بچھا دیا تا کہ یہ خشک ہو جائے۔ پھر سوچا کہ اس کو سوکھنے میں تو دیر لگے گی اور اس طرح میرا وقت ضائع ہوگا۔ چنانچہ آپ نے اپنی لاٹھی کندھے پر رکھی اور اس کے پیچھے پاجامہ لٹکا لیا۔ یہ اسلام کا سفیر اپنی فقیرانہ شان میں جا رہا تھا، حضرتؒ اللہ کی یاد میں مست چلتے رہے۔ حضرتؒ علم کے آفتاب اور ماہتاب تھے، جبالِ علم میں سے تھے۔ مگر اس فقیرانہ انداز میں پہنچے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب اس شہر میں پہنچے تو ایک سرائے میں کمرہ کرائے پر لے کر قیام کر لیا اور سوچا کہ کل میں اپنے وقت پر مجلس کی جگہ پہنچ جاؤں گا۔ ادھر جو لوگ انتظار کے لیے آئے ہوئے تھے، انہوں نے جب دیکھا کہ ٹرین آچکی ہے اور حضرت ابھی تک نہیں آئے تو وہ حیران ہوئے۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا مگر کہیں نہ ملے۔ ان میں سے جو بڑے عالم تھے انہوں نے کہا: بھئی پتا کرو کہ ہوسکتا ہے کہ ٹرین میں نہ آسکے ہوں، لیٹ ہو گئے ہوں، کسی اور ذریعے سے پہنچے ہوں اور شہر میں کہیں آگئے ہوں۔

انہوں نے شہر کی سرائے سے پتا کیا تو قاسم نام کے کسی بندے کا نام نہ ملا۔ انہوں نے کہا کہ میں خود پتہ کرتا ہوں۔ جب انہوں نے خود دیکھا تو انہیں ایک جگہ خورشید حسن کا نام لکھا نظر آیا۔ یہ حضرت کا تاریخی نام تھا۔ حضرت نے اپنے اسی تاریخی نام سے کمرہ بک کروالیا تھا تا کہ کسی کو جلدی پتہ نہ چلے۔ انہوں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ منشی نے کہا کہ یہ ایک بہت ہی نازک بدن والے آدمی ہیں۔ حضرت جسمانی اعتبار سے بہت ہی نرم و نازک تھے، لہٰذا وہ پہچان گئے کہ حضرت یہی ہیں.....ہم لوگ تو شرح کی مانند ہوتے ہیں اور وہ متن کی مانند تھے۔ اِخْتَصَرَ یَخْتَصِرُ اِخْتِصَارًا فَهُوَ مُخْتَصِرٌ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بَسْطَةٌ فِی الْجِسْمِ نہیں بنایا تھا، بلکہ بَسْطَةٌ فِی الْعِلْمِ بنا دیا تھا..... چنانچہ جب انہوں نے دروازہ کھولا تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت موجود ہیں۔ پوچھا: حضرت! آپ یہاں موجود ہیں، ہم تو آپ کا استقبال

کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر جمع تھے۔فرمایا: اسی لیے تو میں اسٹیشن پر گیا نہیں کہ آپ استقبال کے لیے جمع تھے اور میں استقبال کے قابل نہیں ہوں۔اس کے بعد حضرت نے ایک عجیب بات کہی جو سونے کی روشنائی سے لکھنے کے قابل ہے۔فرمایا:

''چند لفظ پڑھ لیے تھے، مخلوقِ خدا پہچان گئی، ورنہ تو قاسم اپنے آپ کو ایسے مٹاتا کہ کسی کو پتا ہی نہ چلتا۔''

اللہ تعالیٰ ایسی سوچ رکھنے والوں کو عزتیں اور بلندیاں عطا فرماتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے طلبا کی تواضع:

حضرت اقدس تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے جس سال دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کیا تو دارالعلوم کی انتظامیہ نے طلبا کی دستار بندی کے لیے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔حضرت اقدس تھانویؒ کچھ اور طلبا کو لے کر اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں پیش ہوئے۔تو شیخ الہندؒ نے پوچھا: اشرف علی! کیسے آئے؟ عرض کیا: حضرت! ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ ہم نے یہ سنا ہے کہ دارالعلوم کی انتظامیہ ہماری دستار بندی کے لیے جلسہ کر رہی ہے، ہم جیسے نالائق طلبا کی دستار بندی ہوگی تو دارالعلوم کی بدنامی ہو جائے گی۔لہٰذا آپ انہیں منع فرما دیں۔یہ سن کر شیخ الہندؒ جلال میں آگئے اور فرمانے لگے: اشرف علی! تم ابھی اپنے اساتذہ کے سامنے ہوتے ہو اس لیے تمہیں اپنا آپ نظر نہیں آتا، جب ہم نہیں ہوں گے تو تم ہی تم ہو گے۔اور واقعی وہ وقت بھی آیا کہ جب تم ہی تم کا سماں تھا۔یوں انہوں نے اپنے آپ کو مٹایا اور اللہ رب العزت نے ان کو اٹھایا۔

کسی شاعر نے ایک عجیب شعر کہا:ؔ

تواضع کا طریقہ سیکھ لو لوگو! صراحی سے کہ جاری فیض بھی ہے اور جھکی جاتی ہے گردن بھی

ایک اور شاعر نے اسی بات کو ایک عجیب انداز سے باندھا ؎

جو اہلِ وصف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے رہتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

جب تک صراحی کا سر نہ جھکے وہ پیمانہ نہیں بھر سکتی۔ اسی طرح اگر ہمارے اندر بھی تواضع ہوگی تو اللہ تعالیٰ ہم سے بھی علم کا فیض جاری فرمادیں گے۔

(۳) زہد:

طالب علم کے اندر جو تیسری چیز ہونی چاہیے وہ ہے ''زہد''

فِيْمَا بَيْنَه وَبَيْنَ الدُّنيَا

''جو بندے اور دنیا کے درمیان ہے۔''

زہد کا مطلب:

زہد کا کیا مطلب ہے؟ زہد کا مطلب یہ نہیں کہ چیزیں کم ہوں، اس کا مطلب ہے، خواہشات کا کم ہونا۔ ورنہ تو قیامت کے دن کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو دنیا میں فقرا ہوں گے اور قیامت کے دن قارون کے ساتھ ان کا حشر ہوگا۔ اس لیے کہ ان کے دل کی چاہتیں ہی ایسی ہوں گی۔ اور کئی دنیا کے بادشاہ ہوں گے اور قیامت کے دن ان کو فقرا کے ساتھ کھڑا کیا جائے گا۔ تو دل کی آرزوؤں کے کم ہوجانے کا نام زہد ہے۔ طلبا کو اس لفظ کو خوب اچھی طرح سمجھنا چاہیے اور اس کی حقیقت کو دل میں بٹھانا چاہیے۔

قناعت کی فضیلت:

دیکھیے! اللہ رب العزت نے ہمیں ایک بڑے کام کے لیے چنا ہے۔ ہم آخرت کے طلب گار بنیں، دنیا

کی طلب کو چھوڑ دیں۔ دنیا طلبی اور چیز ہے، خدا طلبی اور چیز ہے۔ ہم نے خدا طلبی کے راستے کو اپنایا ہے۔ اس لیے رزق کے معاملے میں ہمیں مجاہدہ بھی آئے تو ہم بخوشی قبول کریں۔ لوگ باتیں کرتے رہیں گے۔ مگر تھوڑی دنیا پر راضی ہو جانا بھی بڑی نعمت ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے:

''جو انسان دنیا میں تھوڑے رزق پر اللہ سے راضی ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے تھوڑے عملوں پر راضی ہو جائے گا۔''

رَضِينَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِينَا

ہم پر اللہ رب العزت کی کتنی رحمت ہے کہ اس نے ہمیں علم کے لیے چن لیا۔ ہمارا اللہ تعالیٰ پر احسان نہیں، یہ اللہ رب العزت کا ہم پر احسان ہے۔ الحمدللہ

منت منے کہ خدمتِ سلطان ہمی کنی منت از و شناس کہ در خدمت گزاشتن

''اے مخاطب! تو بادشاہ پر احسان نہ جتلا کہ تو بادشاہ کی خدمت کرتا ہے، ارے! بادشاہ کی خدمت کرنے والے تو لاکھوں ہیں یہ بادشاہ کا تجھ پر احسان ہے کہ اس نے تجھے خدمت کے لیے قبول کر لیا ہے۔''

تمام برائیوں کی جڑ:

دنیا کی محبّت دل سے نکال دیجیے کیونکہ یہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے:

حُبُّ الدُّنيَا رَأسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ

''دنیا کی محبّت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔''

اگر دل میں ہوس بھی نہ ہو اور آرزوئیں بھی کم ہوں تو پھر علم کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ اور اگر طالب علم علم کی طلب میں سنجیدہ نہ ہو تو اس کے لیے یہ علم، علم نافع نہیں بن سکتا۔

علمائے کرام کے رزق کی ترتیب:

یاد رکھیں! جو مقدر میں لکھا ہے وہ یقیناً مل کے رہنا ہے۔لوگ یہ کہتے ہیں کہ جی اگر آپ عالم بنیں گے تو کھائیں گے کہاں سے؟ ایسا کہنے والے یا تو جاہل ہوتے ہیں یا پھر متجاہل ہوتے ہیں۔بھئی! عالم بن کر نہیں کھائیں گے تو پھر کب کھائیں گے۔آپ کوئی ایک مثال بیان فرما دیجیے کہ کوئی حافظ ہو یا عالم ہو اور وہ بھوک پیاس کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا ہو۔کوئی ایک مثال نہیں دے سکتے۔زیادہ کھا کر مرنے والوں کی مثالیں تو ہم بھی دیتے ہیں۔امام مسلمؒ کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا؟ کم کھا کے مرنے کی مثال آپ نہیں دے سکتے۔البتہ، یہ عاجز اسی جگہ بیٹھے ہوئے آپ کو مثال دے سکتا ہے کہ پی ایچ ڈی ڈاکٹر، ایم بی بی ایس ڈاکٹر، ایم اے، ایم ایس سی کیے ہوئے کتنے بندے ایسے تھے کہ جن کے حالات ایسے بنے کہ وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے ایڑیاں رگڑتے ہوے مر گئے۔تو بتائیے کہ رزق کس لائن پر زیادہ ملا؟ اس علم کی لائن پر زیادہ ملا۔فرق اتنا ہوتا ہے کہ آپ کو دفتر سے ملتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اللہ کی طرف سے ملتا ہوا نظر نہیں آتا۔یہ علما وہاں سے کھاتے ہیں جہاں سے انبیاء کھایا کرتے تھے۔کیونکہ یہ انبیا کرام کے وارث ہیں۔ان کا رزق بھی اسی حساب سے ہے۔جیسے تنخواہ ملنے کی ایک روٹین ہوتی ہے، کئی جگہوں پر ہاتھ سے دیتے ہیں اور کئی جگہوں پر بنک کے ذریعے دیتے ہیں، ترتیب مختلف ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رزق کی جو ترتیب انبیائے کرام کے لیے بنائی تھی وہی علمائے کرام کے لیے بنا دی۔

خدا پرستی کوئی اور چیز ہے:

عزیز طلبا! خواہشات کی رو میں نہیں بہنا، بلکہ خواہشات کو تھام لینا ہے۔جس نے اپنے نفس کے ساتھ یہ مقابلہ کر لیا، علم کے راستے اس کے لیے کھل گئے۔اسی لیے بایزید بسطامیؒ فرماتے تھے کہ ''جنت دو قدم ہے''۔کسی نے پوچھا: حضرت! اس کا کیا مطلب ہے کہ جنت دو قدم ہے؟ فرمایا: ''اے دوست! تیرا

پہلا قدم تیرے نفس پر آئے گا تو تیرا دوسرا قدم جنت میں پہنچ جائے گا''۔اگر نفس کی خواہشات کو پورا کریں گے تو علم سے محروم ہو جائیں گے۔یاد رکھنا!

''نفس پرستی،شہوت پرستی،زر پرستی،زن پرستی،یہ سب کی سب بت پرستی کی اقسام ہیں،خدا پرستی کوئی اور چیز ہے۔''

ہم نے خدا پرستی سیکھنی ہے،خواہشات کی پوجا نہیں کرنی۔ہم نے اپنے رب کی مرضی پر عمل کرنا ہے۔یہ سب سے مشکل کام ہے۔جس طالبِ علم نے اپنے نفس کو لگام دے دی،لوہے کا لنگوٹ باندھ لیا۔اس کے لیے پھر اللہ تعالیٰ علم کے دروازے کھول دیتے ہیں۔

اگر یہ تین چیزیں ہمارے اندر آجائیں تو ہمیں رسوخ فی العلم نصیب ہو جائے گا۔

اچھے معلّم کے دو اوصاف:

اب دو باتیں اساتذہ کی خدمت میں.....ادب کے ساتھ.....اچھے معلّم کے اندر دو چیزیں ہونا ضروری ہیں۔

(۱) اخلاص

پہلی چیز اخلاص ہے۔پڑھانے کا مقصد اللہ کی رضا ہو۔اخلاص ہو۔جب اخلاص ہوتا ہے تو پھر انسان جھگڑوں،فتنوں میں نہیں پڑتا،سازشوں میں نہیں الجھتا،بلکہ وہ دین کا کام کرتا ہے۔ہمارے حضرات اخلاص کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا اخلاص:

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ ایک کافر کے سینے پر چڑھ گئے۔چاہتے تھے کہ خنجر مار کر اس کا کام تمام کر دیں اسی لمحے اس کافر نے آپ کے منہ پر تھوک دیا تو آپ پیچھے ہٹ گئے۔اس نے پوچھا: آپ نے مجھے قتل

کیوں نہ کیا؟ فرمایا: میں تجھے پہلے اللہ کے لیے قتل کرنا چاہتا تھا، جب تم نے تھوک پھینکا تو مجھے غصہ آیا، لہٰذا اگر اب میں تجھے قتل کرتا تو اس میں میرا ذاتی انتقام بھی شامل ہوتا، اس لیے میں پیچھے ہٹ گیا، کیوں کہ میں کوئی کام اپنی ذات کے لیے نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے غصے کے عالم میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا کہ میرا ہر کام اللہ کے لیے ہو۔ اس کو اخلاص کہتے ہیں۔

شیخ الہندؒ کا اخلاص:

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہؒ فراغت کے بعد جب ابتدا میں کانپور تشریف لے گئے تو وہاں قریب کے دیہاتوں میں کچھ اہلِ بدعت بھی تھے۔ حضرت نے ایک مرتبہ جلسہ رکھوایا اور اپنے استاذ محترم حضرت شیخ الہندؒ کو بلوایا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند تشریف لائے اور انہوں نے بیان کرنا شروع کر دیا۔ اللہ کی شان کہ حضرت اقدس تھانویؒ جو مضمون چاہتے تھے کہ یہ بیان ہو، وہی شروع ہو گیا۔

عین اس وقت جب مضمون اپنے عروج پر تھا اس وقت ایک عالم مولانا لطف اللہ علی گڑھی، جو مائل بہ بدعت تھے، اس طرف تھوڑا سا میلان تھا، وہ آ گئے۔ اب ان کو دیکھ کر لوگوں نے یہ سوچا کہ اب وقت ہے یہ مضمون بیان ہونے کا۔ جیسے ہی وہ آ کر بیٹھے، حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا، ''وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ'' اور بیٹھ گئے۔

اب اس طرح ایک دم تقریر بند کر دینا بڑا عجیب سا لگا۔ خیر! بعد میں کھانے کے دسترخوان پر ہی مولانا فخر الحسن نے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: بھئی! وہ تو وقت تھا بیان کرنے کا، مولانا لطف اللہ آئے تھے تو آپ نے تو ایک دم ہی تقریر بند کر دی۔ آپ نے فرمایا: ہاں! مجھے بھی یہی خیال آ گیا تھا کہ اب وقت آیا ہے مضامین بیان کرنے کا، لیکن میرے دل میں خیال آیا کہ اب میں اس کو سنانے کے لیے یہ بیان کرتا ہوں تو یہ اس کے لیے ہو گا اللہ کی رضا کے لیے نہیں ہو گا چنانچہ میں نے بیان بند کر دیا۔ بیان میں بھی اس

بات کا خیال ہوتا تھا کہ میری ہر بات اللہ کی رضا کے لیے ہو۔اگر اس طرح کا اخلاص آجائے تو دینی اداروں کے سب جھگڑے ختم ہوجائیں۔

اخلاص کی اہمیت:

اخلاص اتنا ضروری ہے کہ

☆علم کی کمی عمل پوری کر جاتا ہے،

☆عمل کی کمی اخلاص پوری کر جاتا ہے،مگر

☆اخلاص کی کمی کبھی پوری نہیں ہوا کرتی۔

اسی لیے فرمایا:

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ(الزمر:21)

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ(البینہ:5)

ملاوٹ والے عمل اللہ کو پسند نہیں:

بھئی! ملاوٹ کو تو دنیا بھی پسند نہیں کرتی۔حدیث پاک میں نبی علیہ السّلام نے فرمایا:

مَن غَشَّ فَلَيسَ مِنَّا

''جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔''

جس طرح لوگ مادی چیزوں میں ملاوٹ کو پسند نہیں کرتے اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی عمل میں ریا کی ملاوٹ کو پسند نہیں فرماتے۔اگر آپ کو ملاوٹ والی کوئی چیز ملے تو آپ اس کو فوراً رد کر دیتے ہیں۔اللہ رب العزت بھی اسی طرح فرماتے ہیں کہ اگر ملاوٹ والے عمل لاؤ گے تو ہم بھی ان کو رد کر دیں گے۔

ہیرے اور اخلاص کی قیمت میں فرق:

ایک مرتبہ مجھے کوئی صاحب دعا کروانے کے لیے لے گئے۔ مجھے پوچھنے لگے: حضرت! آپ نے کبھی ہیرے دیکھے ہیں؟ میں نے کہا: میں اس لائن کا بندہ نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے اتنا شوق ہے۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اس کو کھول کر مجھے ہیرے دکھانے لگا اور ساتھ ساتھ بتانے بھی لگا کہ یہ اتنے لاکھ کا ہے اور یہ اتنے لاکھ کا ہے۔ ہم تو سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ ہم نے کہا: یہ تو بہت چھوٹے ہیں اور آپ قیمت زیادہ بتا رہے ہیں۔ کہنے لگے: حضرت! ہیرا ہمیشہ چھوٹا ہوتا ہے لیکن قیمت میں بڑا ہوتا ہے۔ اس وقت مجھے یہ بات یاد آئی کہ قیامت کے دن اخلاص نیت کی وجہ سے جن لوگوں نے کام کیے ہوں گے ان کے عمل اگرچہ چھوٹے ہوں گے مگر اللہ کے ہاں ان کی قیمت بڑی موٹی ہوگی۔

مفتی محمد حسنؒ کا اخلاص:

مفتی محمد حسنؒ نے لاہور میں جامعہ اشرفیہ کی بنیاد رکھی۔ شروع میں وہاں چھوٹی سی مسجد تھی اور چھوٹا سا جامعہ تھا۔ ان کے ہاں ایک ایسے عالم تھے جو حضرت مدنیؒ کی طرف کچھ میلان رکھتے تھے۔ اسی طرز پر جلسے اور سیاست.....اور ان کا مزاج ذکر والا تھا۔ وہ نیک انسان تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اکٹھا رہنے میں آپس میں کہیں کوئی تنازعہ نہ کھڑا ہو جائے، اختلافِ رائے نہ بڑھ جائے، لہٰذا ایک سال مکمّل ہونے پر انہوں نے اسی محلے میں ایک دوسرے جامعہ کی بنیاد رکھ دی۔

جب انہوں نے نئے جامعہ کی بنیاد رکھی تو لوگ بڑے غصے میں آ گئے کہ اگر نیا جامعہ بنانا ہی تھا تو کہیں دور بنا لیتے۔ اسی جگہ، قریب میں نیا جامعہ کھولنا مناسب تو نہیں۔

اس سلسلے میں مفتی محمد حسنؒ کے ایک صاحبزادے نے اپنا ایک واقعہ مجھے خود سنایا۔ فرمانے لگے کہ میں کسی کام کے لیے جا رہا تھا تو ایسے ہی میں نے اپنے والد صاحب سے کہا: ابا جی! آپ نے دیکھ لیا ہے کہ

انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟ ابا جی نے پوچھا: بیٹا! کہاں جارہے ہو؟ میں نے کہا: امی نے کام بھیجا ہے۔ فرمایا: تم وہ کام کر کے آؤ، پھر میں آج تمہیں اخلاص کا درس دوں گا۔

جب میں وہ کام کر کے واپس آیا تو بیٹھ گیا اور عرض کیا: ابا جی! بتائیں۔ تو والد صاحب نے مجھ سے پوچھا: یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے سر پر کسی چیز کا اتنا بوجھ ہو کہ تم سے اٹھایا نہ جارہا ہو، حتی کہ گردن ٹوٹنے کے قریب محسوس ہو، تم انتہائی مشقّت کے ساتھ وہ بوجھ لے کر جارہے ہو، اور ایسے وقت میں کوئی دوسرا بندہ آجائے اور یہ کہے کہ تم آدھا بوجھ مجھے دے دو میں اپنی ذمہ داری سے منزل پر پہنچا دوں گا، تو اب بتاؤ کہ وہ تمہارا دوست ہوگا یا تمہارا دشمن ہوگا؟ میں نے کہا: حضرت! وہ دوست ہوگا۔ تو ابا جی نے فرمایا: دیکھو بیٹا! یہ اتنا بڑا شہر تھا اور اس میں یہ ایک دارالعلوم تھا اور اتنے بڑے شہر کی مسئولیت کا بوجھ صرف ہمارے سر پر تھا، اب ایک دوسرا مدرسہ بن گیا ہے اور یوں قیامت کے دن جو پوچھا جائے گا اس کا بوجھ تقسیم ہو گیا، اب ان بوجھ تقسیم کرنے والوں کو دوست سمجھیں یا دشمن سمجھیں؟ سبحان اللہ! کتنے بڑے مسئلے کو کتنے پیار سے حل کر دیا۔ اس کو اخلاص کہتے ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ کا اخلاص:

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا درد عطا فرمایا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ فرنگی یہاں سے دفع ہو جائے اور ہم اپنے دین والی زندگی کو عمل میں لاسکیں۔ چنانچہ وہ اس کے لیے بہت متحرک رہتے تھے۔ اور ان کی طبیعت ایسی تھی کہ جب ان کے پاس کوئی مہمان آتا تھا تو وہ مہمان کو بڑے پیار سے رکھتے تھے۔ اس کی خوب خدمت بھی کرتے تھے اور اس کو بڑی محبّت دے کر بھیجتے تھے۔

حضرت اقدس تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں اصلاح کا پہلو غالب تھا۔ جو طالب بھی آتے تھے حضرت ان پر سختی فرماتے تھے۔ کیونکہ جب تک سختی نہ ہو تب تک اصلاح نہیں ہوتی..... حضرت مرشد

عالم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''دب نہ ہو تو ادب پیدا نہیں ہوتا''۔ اس لیے سختی کرنی پڑتی ہے۔ مگر مشائخ کی سختی بھی اللہ کی رضا کے لیے ہوتی ہے۔ اپنے نفس کے لیے نہیں ہوتی..... چنانچہ حضرت اقدس تھانویؒ کے پاس جب کوئی آتا تھا تو اس کو بات سمجھائی جاتی تھی اور آگے سے وہ نہ مانتا تو حضرت اس کا بستر اٹھوا کر باہر نکال دیتے تھے۔ جیسے حضرت مجذوبؒ سے کوئی بات ہوگئی تھی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ تم اپنا بستر اٹھاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔ مگر وہ طالبِ صادق تھے۔ انہوں نے سوچا کہ حضرت نے تو مسجد سے ہی نکالا ہے نا، مسجد کے باہر تو میں بیٹھ سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ دروازے کے سامنے بیٹھ گئے اور جب دروازہ کھلتا تو اپنے شیخ کی زیارت کر لیتے اور بیٹھے وہیں رہتے تھے۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ وہ وہاں سے گئے نہیں وہاں سے۔ ایک دن حضرت بڑے حیران ہوئے کہ میں نے اسے بھیج بھی دیا تھا اور یہ اتنے دنوں سے دروازے پر ہی بیٹھا ہے۔ حضرت نے اپنے ایک خادم سے کہا: جا کر اس سے پوچھو یہ چاہتا کیا ہے؟ حضرت مجذوبؒ شاعر تھے۔ چنانچہ انہوں نے جواب میں ایک شعر لکھ کر بھیجا۔

اُدھر تو در نہ کھولے گا اِدھر میں در نہ چھوڑوں گا حکومت اپنی اپنی ہے اُدھر تیری اِدھر میری

حضرت کو یہ بات اتنی پسند آئی کہ اسی وقت ان کو بلایا اور ان کی غلطی کو معاف کر دیا۔

ادھر حضرت مدنیؒ آنے والے مہمانوں کے ساتھ بہت پیار محبّت سے پیش آتے تھے۔ ایک آدمی حضرت مدنیؒ کے پاس آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کھانا بھی کھلایا، پاس بھی بٹھایا، اچھی اچھی باتیں بھی سنائیں اور رات کو جب سونے لگا تو حضرت نے اس کے پاؤں بھی دبائے۔ جب اس نے بے نفسی کا یہ عالم دیکھا تو کہنے لگا: حضرت! یہ ہوا نا دین۔ آپ تو بندوں کے ساتھ ایسے پیش آتے ہیں ان کا قربان ہونے کو دل چاہتا ہے اور اگر حضرت تھانوی کے پاس چلے جائیں تو وہاں تو یوں لگتا ہے کہ بس لٹھ لے کر بیٹھے ہیں اور وہاں تو بڑی سختی ہوتی ہے۔

دیکھیں! اختلافِ رائے ہو تو عام طور پر بندہ تیلی لگا دیتا ہے۔ اگلے دن تھوڑی سی بات کی اور اس کو بھڑکا دیا، مگر نہیں، یہ ہمارے اکابر کا اخلاص تھا کہ جب اس نے ایسی بات کی تو حضرت مدنیؒ نے فوراً کہا: بھئی نہیں، ایسی بات نہیں ہے، تم معاملے کو سمجھے ہی نہیں۔ اس نے پوچھا: حضرت معاملہ کیا ہے؟ فرمایا: دیکھو! جو بڑے سرجن ہوتے ہیں وہ انسان کے اندر سے پیٹ وغیرہ نکال کر چیرا دیتے ہیں اور اس کو نچوڑ کر نکالتے ہیں، اس وقت بندے کو تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اور جب وہ بندہ کمپوڈر کے پاس آتا ہے تو کمپوڈر اس پر مرحم لگا کر پیار سے اس کو بند کر دیتا ہے، حضرت کی کیفیت سرجن کی مانند ہے اور میری کیفیت ایک کمپوڈر کی مانند ہے۔ یہ اخلاص تھا ہمارے اکابر میں۔

داغی عملوں کے بدلے جنت:

آپ اگر بازار پھل لینے کے لیے جائیں اور آپ کو ایک روپے کے بدلے میں کوئی داغی سیب دے دے تو آپ قبول نہیں کریں گے۔ کوئی گلا ہوا کیلا دے دے تو آپ کہتے ہیں: جی! تولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جس طرح ہم ایک روپے کے بدلے میں گلے ہوئے پھل کو تولنے کی بھی اجازت نہیں دیتے، بالکل اسی طرح قیامت کے دن اللہ رب العزت اپنی جنتوں کے بدلے میں ریا والے گلے ہوئے عملوں کو میزان پر تلنے ہی نہیں دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (الکھف:105)

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تم ایک روپے کے بدلے میں داغی پھل کو قبول نہیں کرتے تھے، میں جنتوں کے بدلے میں تمہارے داغی عملوں کو کیسے قبول کروں۔ آپ کی دنیا QCC (کوالٹی کنٹرول سنٹرز) بناتی ہے۔ ہر بندہ کہتا ہے کہ میں نے پیسے دینے ہیں اس لیے مجھے چیز کی کوالٹی چاہیے۔ اللہ رب العزت نے

بھی جنتیں دینی ہیں، اپنی رضا دینی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کو بھی عملوں کی کوالٹی چاہیے۔

خسارے کا سودا:

یاد رکھیے! یہ جو دنیا تعریفیں کرتی ہے، اکرام کرتی ہے اور عزت کرتی ہے یہ بندے کے عملوں کا اجر ہوتا ہے جو مل رہا ہوتا ہے.....ہم ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دنوں ہمارے ایک انجینیئر دوست کسی مشکل میں پھنس گئے تھے، انہیں پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ بے چارے بہت آزردہ تھے کہ میرے پاس وسائل نہیں ہیں اور یہ کام کرنا بھی ضروری ہے۔

اتنے میں ان کو کیشیر کا فون آیا کہ آپ آ کر پیسے لے جائیں۔ وہ فون سن کر بڑے خوش ہوئے اور خوش خوش کیشئر کے پاس کہ مجھے بیس پچیس ہزار ملیں گے اور میرا کام ہو جائے گا۔ لیکن جب وہ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم نے پوچھا کہ کیا بنا؟ کہنے لگے: جی! بس کیشئر کو غلطی ہوئی۔ واؤچر تو میرے ہی نام کے تھے مگر ان کی ادائیگی ہو چکی تھی اور ان پر مہر لگانا بھول گئے تھے۔ جب اس نے تاریخ دیکھی اور ملایا تو ریکارڈ نے بتایا کہ یہ پہلے پے آف ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اس نے کہا ہے کہ اب تو میرے پاس کچھ نہیں۔

جب اس نے یہ بات کہی تو فوراً میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ دیکھو! یہ بندہ امید لے کر گیا تھا کہ مجھے کیشئر سے نقدی مل جائے گی، مگر Paid Off (ادا شدہ) واؤچر کی وجہ سے اس بندے کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ یاد رکھنا! جن عملوں کو ہم دنیا کی ناموری کی وجہ سے کرتے ہیں، یہ سب ہمارے پیڈ آف واؤچر ہیں، قیامت کے دن جب اللہ کے پاس جائیں گے تو فرمائیں گے، اے میرے بندے! ''فَقَدْ قِيْلَ'' یہ تو پیڈ آف ہو چکے ہیں، تمہیں دنیا میں ہی اس کا اجر مل چکا ہے، کسی نے تمہاری تعریف کر دی تھی، اب ہمارے پاس اس کا کوئی بدلہ نہیں۔ سوچیے کہ اس وقت ہمارا کیا بنے گا؟ کیا یہ مشقتیں ہم دو لفظوں کی

خاطر اٹھاتے ہیں۔ اگر ہم اس لیے عمل کرتے پھرتے ہیں کہ کوئی بندہ اچھے الفاظ کہہ دے یا ہمیں اچھا سمجھ لے تو پھر ہم نے بڑے خسارے کا سودا کرلیا۔ کاش! ہم اللہ رب العزت کی رضا کے لیے عمل کرتے اور دنیا سے کوئی طمع نہ ہوتی۔ قیامت کے دن ہمیں اس کا اجر ملتا، پھر پتا چلتا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان عملوں کی کتنی قدر و قیمت ہے!

ریا کے باعث ثواب سے محرومی:

ایک مرتبہ بایزید بسطامیؒ نے سورۃ طٰہٰ پڑھی۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ نامہء اعمال میں سورۃ طٰہٰ سونے کے پانی سے لکھی ہوئی ہے۔ وہ بڑے خوش ہوئے کہ اللہ رب العزت نے میرا اس سورت کو پڑھنا قبول فرمالیا ہے۔ پھر وہ خوشی خوشی اپنے نامہ اعمال کو دیکھنے لگے۔ جب ایک صفحہ الٹا تو اس میں کچھ خالی جگہ نظر آئی؟ وہ یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ اس میں خالی جگہ کیوں ہے؟ تو خواب ہی میں دل میں خیال آیا، اوہو! جب میں یہ الفاظ پڑھ رہا تھا تو میرے قریب سے ایک آدمی گزرا تھا اور اس وقت میرے دل میں یہ بات آئی تھی کہ یہ میری قرات سن کر خوش ہوگا کہ میں کتنا اچھا پڑھ رہا ہوں! دل میں اس خیال کے آنے پر پروردگار نے ان آیتوں کے ثواب سے محروم فرمادیا.....اخلاص اتنا اہم ہے۔

(۲) اختصاص

معلّم کے اندر دوسری صفت ''اختصاص'' کی ہونی چاہیے۔ کیونکہ تعلیم و تعلم کا کام فقط اخلاص سے ہیں نہیں چلتا۔ آدمی مخلص تو بڑا ہو لیکن پلے ہی کچھ نہ ہو، آتا جاتا کچھ نہ ہو، تو طلبا کو کیا فائدہ ملے گا؟ اس کا اخلاص کس کام آئے گا؟ چنانچہ معلّم کو ہر اس کتاب میں تخصص حاصل ہو جس کو یہ پڑھانا چاہتے ہیں۔ اگر نہیں تو اپنے مطالعہ سے یہ چیز حاصل کریں۔ بھئی! جب ایک مضمون ملا ہے تو اس میں کما حقہ محنت کیجیے تاکہ آپ کو اس کے پڑھانے میں تخصص حاصل ہو جائے۔

ہمارے اکابر علمائے دیوبند میں یہ دونوں نعمتیں تھیں۔اخلاص بھی تھا اور اختصاص بھی تھا۔ان کے پاس جو مضمون ہوتا تھا اس مضمون میں وہ بادشاہ ہوتے تھے۔

طلبا کی استعداد بنانے کا طریقہ:

دارالعلوم کی طرف سے ''شرح تہذیب'' پڑھانے کی ملتی تھی تو سب سے پہلے طلبا کو ''قال اقول'' رسالہ پڑھاتے تھے۔ پھر ''ایساغوجی'' پڑھاتے تھے۔ پھر ''مرقات'' پڑھاتے تھے۔ ایسا کیوں کرتے تھے؟ استعداد بنانے کے لیے۔اس کے بعد اصل کتاب شرح تہذیب پڑھایا کرتے تھے۔اور آج حالت یہ ہے کہ جن کو شرح تہذیب دی جاتی ہے، پورے سال میں اس کو ہی ختم نہیں کر پاتے۔استعداد مسلم کی ہوتی تھی اور پڑھاتے مرقات تھے، آج پڑھا مسلم رہے ہوتے ہیں اور استعداد مرقات کی ہوتی ہے۔آج اختصاص کی کمی ہے۔وعظ کر کے طلبا کو بھگتا دینا تو آسان کام ہے مگر یہ علم کے ساتھ دیانت نہیں، بلکہ یہ بددیانتی کہلاتی ہے۔

شیخ الہندؒ اور اختصاص علم:

ایک مرتبہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی لائبریری کی کتابوں کو نکلوا کر دھوپ میں رکھا..... برسات کے موسم میں چیزیں بھیگ جاتی ہیں اور دیمک لگ جاتی ہے۔..... جب دھوپ میں کتابیں رکھیں تو ایک طالب علم نے کہا: حضرت! ایک کتاب کے پانچ چھ صفحے دیمک نے کھا لیے ہیں۔فرمایا: پھر دوسرا کاغذ ساتھ جوڑ دو۔اس نے دوسرا کاغذ لگا دیا اور پوچھا: حضرت! اب کیا کروں؟ فرمایا: جو عبارت حذف ہو چکی ہے وہ لکھ دو! اس نے کہا: حضرت! مجھے تو وہ زبانی یاد نہیں ہے اور اصل نسخہ بھی نہیں ہے، میں نے تو یہ کتاب کئی سال پہلے پڑھی تھی، اب بھول چکا ہوں، کیسے لکھوں؟ فرمایا: بس بھول گئے؟ کون سی کتاب ہے؟ کہنے لگا: حضرت! میبذی۔پوچھا: کہاں سے عبارت منقطع ہوئی ہے؟ اس نے کہا: فلاں جگہ سے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے زبانی چھ صفحے کی عبارت اس بچے کو کتاب پر لکھوادی۔ ان کو یوں اختصاص حاصل تھا۔

مولانا یحییٰؒ اور اختصاصِ علم:

مولانا یحییٰ نے مسلم کو دوسو مرتبہ تسبیح پر پڑھا۔ ان حضرات کی زندگی ہی کتابوں میں گزری تھی۔ ان کو کثرتِ مطالعہ کا ایسا شوق ہوتا تھا۔ جب تخصص حاصل ہوگا تو پھر دیکھیے گا کہ کام کیسے بنتا ہے؟

مولانا نور محمد پونٹویؒ اور اختصاصِ علمؒ:

حضرت شیخ الہندؒ کا ایک شاگرد تھا۔ اس کا نام مولانا نور محمد پونٹویؒ تھا۔ آپ نے شرح مأۃ عامل پونٹوی دیکھی ہوگی..... پونٹہ ایک شہر ہے جو ملتان سے ستر پچھتر میل دور مین سڑک سے تیس کلومیٹر اندر ہے۔ طلبا تیس کلومیٹر پیدل سفر کرکے سر پر سامان اٹھا کر ان کے پاس پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ اس گاؤں میں تین سو طلبا ان کے پاس پڑھا کرتے تھے۔ وہاں تانگہ بھی نہیں جاتا تھا۔ طلبا اپنا سامان سر پر اٹھا کر وہاں جاتے تھے۔

ایک دلچسپ بات آپ کو بتادوں۔ طلبا خود پڑھیں یا نہ پڑھیں، یہ جاتے وہیں ہیں جہاں پڑھائی اچھی ہو، یہ پکی بات ہے۔

علامہ شریف کشمیریؒ خیر المدارس سے قاسم العلوم آگئے تو ایک طالب علم بھی قاسم العلوم پہنچ گیا۔ ایک استاد نے اس کو دیکھا تو پوچھا: آپ یہاں کیسے؟ کہنے لگا: اس لیے کہ شیخ الحدیث صاحب آگئے ہیں۔ انہوں نے کہا: شیخ الحدیث صاحب تو بخاری شریف پڑھائیں گے اور تو ابھی مرقات کے درجے میں ہے، اس سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟ کہنے لگا: حضرت! جہاں بڑے استاد محنت کرنے والے ہوں وہاں چھوٹوں کو خود بخود محنت کرنی پڑتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا نور محمد پونٹوی رحمۃ اللہ علیہؒ کو کیا مقام عطا فرمایا تھا؟ مولانا خیر محمد جالندھریؒ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ مدرسہ کے سالانہ جلسے میں اکابرین کی موجودگی میں مولانا نور محمد پونٹوی رحمۃ اللہ علیہؒ کے بارے میں کہا: شمس النحاۃ تشریف لائے ہیں۔ ایسے محتاط بندے کا کسی کو ''شمس النحاۃ'' کہنا کوئی معنی رکھتا ہے۔

ان کو علم میں اتنا کمال حاصل تھا کہ فرمایا کرتے تھے: اگر ساری دنیا سے شرح جامی ضبط کر لی جائے، مٹا دیا جائے اور کوئی آدمی نور محمد کے پاس آ کر کہے کہ شرح جامی کی ضرورت ہے تو میں اس متن اور حاشیے کے ساتھ شرح جامی دوبارہ لکھوا سکتا ہوں۔ ان کو یہ اختصاص حاصل تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو دو عظیم شاگرد دیے۔ عباد اللہ۔ دونوں کا نام عبداللہ تھا۔ ایک عبداللہ بہلوی تھے۔ ماشاء اللہ وہ شیخِ طریقت بھی تھے اور مفسرِ قرآن بھی تھے۔ جب حضرت مولانا نور محمد پونٹویؒ شجاع آباد میں آئے تھے تو عبداللہ بہلوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے تمام طلبا سے کہہ دیا کرتے تھے کہ ان کی جوتیوں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے، یہ اعزاز میں حاصل کروں گا۔ چنانچہ جب شیخ آتے تھے تو دارالعلوم کے مہتمم مولانا عبداللہ بہلوی رحمۃ اللہ علیہؒ حضرت کے جوتے خود اٹھایا کرتے تھے۔ دوسرے شاگرد مولانا عبداللہ درخواستی رحمۃ اللہ علیہؒ تھے۔

ایسے شاگردوں کے آنے کی وجہ بھی عجیب تھی۔ اس کے پیچھے شیخ الہندؒ کی دعائیں تھیں۔ وجہ یہ بنی کہ انہوں نے شیخ الہندؒ سے دورہ حدیث کیا۔ دورانِ تعلیم یہ رات کو چھپ کر جس راستے سے حضرت دارالحدیث میں آتے تھے، اپنے عمامے کے ساتھ اس راستے کی صفائی کیا کرتے تھے۔ ایک رات شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہؒ نے دیکھ لیا۔ انہوں نے بلا کر پوچھا: نور محمد! کیا کر رہے ہو؟ عرض کیا: حضرت آپ اس راستے سے حدیث کا درس دینے آتے ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس راستے کو صاف کروں مگر جھاڑو

کے بجائے میں اپنے عمامے سے صاف کرتا ہوں۔ بس یہ سنتے ہی استاد کے دل میں محبّت آئی اور استاد نے دعا دے دی۔ ان کی دعا کام آگئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو شمس النحاۃ مولانا نور محمد پونٹوی رحمۃ اللہ علیہؒ بنا دیا۔ یوں طلباء اپنے اساتذہ سے دعائیں لیتے تھے۔

علمی کاموں کی لگن:

جب اخلاص بھی ہو اور اختصاص بھی ہو تو پھر بندے کے اندر ایک لگن ہوتی ہے اور وہ اس لگن کے ساتھ اپنے کام میں مگن ہوتا ہے۔ پھر اس کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ اِدھر اُدھر کی باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔ مولانا یحییٰؒ کے دل کے اندر خواہش پیدا ہوئی کہ میں دھوپ میں بیٹھ کر گنا چوسوں۔ چنانچہ سوچا کہ جب فرصت ملی تو چوسوں گا۔ ان کو بیس سال تک گنا چوسنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ وہ ہر وقت علمی کام میں مشغول ہوتے تھے اور وقت فارغ ہی نہیں ہوتا تھا۔ جب اختصاص حاصل کریں گے تو آپ ہر وقت کتب کے مطالعہ میں لگے رہیں گے۔ پھر یہ کتابیں ایک گلشن نظر آئے گا اور اوڑھنا بچھونا نظر آئے گا۔ پھر مدرسہ وطن نظر آئے گا اور کتابوں کا کاغذ کفن نظر آئے گا۔ اگر آپ اپنے اندر یہ چیز پیدا کر لیں گے تو ایک مقصد کے تحت زندگی گزرے گی۔

خدمتِ اسلام کا جذبہ:

ایک مرتبہ انگریزوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہؒ کو گرفتار کر لیا۔ حضرت نے جیل کے اندر ایک قیدی کو قرآن مجید پڑھانا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے بعد آپ کی آزادی کے نوٹس آگئے۔ جب جیلر نے آکر حضرت کو بتایا کہ آپ کی گرفتاری ختم ہوگئی ہے۔ آپ نے فرمایا: میں تو ابھی گھر نہیں جاتا۔ اس نے پوچھا: کیوں؟ فرمایا: میں فلاں قیدی کو قرآن مجید پڑھا رہا ہوں، جب تک مکمّل نہیں کروں گا گھر نہیں جاؤں گا۔ یہ تھے ہمارے اسلاف۔ اگر اس طرح علم کی خدمت کا جذبہ ہوگا اور ساتھ ساتھ اخلاص اور

اپنے مضامین کے اندر مہارت ہوگی تو پھر دیکھنا طلبا شمع کے گرد پروانے کی طرح آئیں گے۔

لمحہ فکریہ:

عزیز طلبا! آج کے دور میں جب ہر طرف بے راہ روی بڑھ رہی ہے، عریانی اور فحاشی کا دور دورہ ہے، کیا مشرق اور کیا مغرب! ہر طرف حیا زندگیوں سے نکلتی جا رہی ہے۔ ایسے دور میں دین کی محنت کرنا اور دین کے لیے کام کرنا اللہ کے ہاں بڑی قبولیت کا باعث ہے۔ بس دل میں یہ رکھیے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو ایک چڑیا اپنی چونچ میں ایک دو قطرے پانی لے کر جاتی اور آگ پر گراتی تھی۔ کسی پرندے نے اس سے کہا: بی چڑیا! تیرے دو قطرے پانی سے تو یہ آگ نہیں بجھے گی۔ وہ چڑیا کہنے لگی: یہ تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ میری چونچ کے اس پانی سے آگ نہیں بجھے گی۔ مگر میں نے ابراہیم خلیل اللہ کی دوستی تو نبھانی ہے نا۔ تو بھئی! گناہوں کی یہ آگ تو پتا نہیں پوری کی پوری بجھ پائے گی یا نہیں، لیکن ہم نے آقا ﷺ کی غلامی تو نبھانی ہے نا۔ جو ہمارے بس میں ہے، بس ہم وہ کر دیں اور باقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت مانگیں۔ پھر پرودگار اپنی رحمت عطا فرما دیں گے۔

عزیز طلبا! آج کے دن اپنے دلوں میں عہد کر لیجیے کہ ہم گناہوں سے بچیں گے۔ یہ گناہوں کی آگ جو ہم اپنے جسموں پر روز جلاتے ہیں، عہد کر لیں کہ ہم نہیں جلائیں گے۔ کیونکہ یہ معصیت اللہ تعالیٰ سے دوری ہے۔ یوں سمجھیں کہ شیطان نے ہمیں سو رسیوں سے باندھا ہوا ہے، اب ہم نے ان میں سے جتنے گناہ چھوڑ دیے اتنی رسیاں توڑ دیں اور جو گناہ نہیں چھوڑے اتنی رسیوں میں ہم ابھی تک جکڑے ہوئے ہیں۔ ہمارا تجربہ ہے کہ الحمد للہ! مدارس کے اندر رہنے والے طلبا کی زندگی میں بہت بڑے بڑے گناہ نہیں ہوتے۔ کوئی پچانوے فیصد گناہ چھوڑ چکا ہوتا ہے کوئی چھیانوے فیصد اور ایک دو فیصد پہ آ کر کام اٹکا ہوتا ہے۔

☆کسی کی نگاہ قابو میں نہیں،

☆کسی کا دل قابو میں نہیں،

☆کسی کی زبان قابو میں نہیں،

بس چند ایک گناہوں میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں اور باقی زندگی شریعت وسنت کے مطابق گزار رہے ہوتے ہیں، ان گناہوں کی وجہ سے بھی ان کے دلوں میں شرمندگی کا احساس ہوتا ہے، البتہ ان کو بھی چھوڑ کر اب اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً (البقرہ:208) کا مصداق بن جانا چاہیے۔ آپ یوں سمجھیے کہ آپ اٹھانوے رسیوں کو توڑ چکے ہیں اور صرف دو رسیاں باقی ہیں۔ اب ان دو رسیوں سے آزادی حاصل کرنا تو بہت آسان ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ اللہ رب العزت تک پہنچنے کے لیے ہم نے سو قدم اٹھانے تھے، ان میں سے ہم نے اٹھانوے قدم اٹھا لیے، اب صرف دو قدم باقی ہیں، یہ دو قدم بھی اٹھا لیے تو منزل مل جائے گی۔ اگر کوئی مسافر منزل سے دو قدم پہلے آ کر بیٹھ جائے اور منزل پر نہ پہنچ پائے تو اس پر کتنا افسوس ہوتا ہے!

حسرت ہے اس مسافرِ مضطر کے حال پر
جو تھک کر رہ گیا ہو منزل کے سامنے

ہم بھی منزل کے سامنے ہیں اور ایک دو گناہوں کی وجہ سے منزل سے رکے ہوئے ہیں۔ اب ان گناہوں کو بھی اللہ کی رضا کے لیے چھوڑ دیجیے۔ اگر ہمارے لیے گناہوں کو چھوڑنا مشکل ہے تو ہم اللہ رب العزت سے دعا تو مانگ سکتے ہیں رو رو کر دعا مانگیں کہ اللہ! ہمیں گناہوں سے بچا لیجیے۔ گناہوں کی ذلت سے ہمیں نکال لیجیے۔ گناہوں کی دلدل سے نکال لیجیے۔ جب ہم یہ دعا مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ

رحمت فرمادیں گے۔

حضرتِ اقدس تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک بندے کو کھڑا کیا جائے گا، اس سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، میرے بندے! تو نیک کیوں نہ بنا؟ تو وہ کہے گا: اللہ! میں دعائیں تو مانگتا تھا کہ تو مجھے نیک کردے، جب نامہء اعمال میں دعا موجود ہوگی تو اللہ تعالیٰ اسی کو ذریعہ بنا کر اس کی مغفرت فرما دیں گے۔ فرمائیں گے: ہاں! ہم سے دعائیں تو مانگتا تھا کہ اللہ! نیک بنادے۔ ربّ کریم ہمارے لیے نیک بننا آسان فرمادے (آمین ثم آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ